GIRRAJ GOVT COLLEGE(A)
NIZAMABAD
DEPARTMENT OF URDU

STUDENTS STUDY PROJECT IN URDU

TOPIC

اقبال کی منتخب نظمیں ایک مطالعہ

IQBAL KI MUNTAQAB NAZMEN EK MUTALEA

SUPERVISED BY

Dr M Aslam Faroqui

SUBMITTED BY

B.Com I Year U/M Students

DEPT OF URDU -2017

GIRRAJ GOVT COLLEGE (A) NIZAMABAD

DEPARMENT OF URDU

CERTIFICATE

This is to certify that the students study project entitled " Iqbal Ki Muntaqab Nazmen Ek Mutalea" is an original work carried out by bonafide students of B.Com I year U/M sutdents in the academic year 2016-17 under the supervision of Dr Mohd Aslam Faroqui Head Dept of Urdu Girraj Govt College(A) Nizamabad.

Project Presenters

B.Com I year U/M sutdents

S.NO	NAME OF THE STUDENT	ROLL NO
1	Ayesha Begum	1605-5005-401-903
2	Ayesha Siddiqa	1605-5005-401-904
3	Farha Naaz	1605-5005-401-906
4	Ghazala Mohammadi	1605-5005-401-907
5	Nilofer Firdouse	1605-5005-401-918
6	Sana Kouser	1605-5005-401-920

Supervisor Principal

اقبال کی منتخب نظمیں ایک مطالعہ۔ تحقیقی پراجکٹ

تحقیقی پراجکٹ کا تعارف: اقبالؔ اردو کے نامور شاعر گذرے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے حرکت و عمل کا پیغام دیا۔ خودی اور مرد مومن کے جذبے کو پروان چڑھایا۔ ان کی نظمیں بچوں اور بڑوں سب کے لیے زندگی کی مثبت قدروں کا پیغام رکھتی ہیں۔ تحقیقی پراجکٹ ''اقبال کی منتخب نظمیں ایک مطالعہ'' کے ذریعے اقبال کی اہم نظموں کا مطالعہ پیش کیا جائے گا اور عصر حاضر کے بچوں اور نوجوانوں کے لیے ان نظموں کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تحقیقی پراجکٹ کی اہمیت: موجودہ اخلاقی بگاڑ کے دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے شعر و ادب میں موجود صالح قدروں کی شناخت کی جائے اور انہیں اس طرح کے تحقیقی پراجکٹس کے ذریعے عام کیا جائے۔ اقبال بیسویں صدی کے ایک مفکر اور اعلیٰ انسانی قدروں کا پیغام دینے والے شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے پیغام کو عام کرنے کے لیے اس پراجکٹ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس پراجکٹ میں ان کی منتخب نظموں کا مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

طریقہ کار: اس تحقیقی پراجکٹ میں سب سے پہلے اقبال کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔ اس کے بعد ان کی اہم نظموں کا مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ ہر نظم کے مطالعے کے ساتھ اس نظم سے ملنے والے سبق کو اجاگر کیا جائے گا۔ آخر میں اقبال کی نظموں سے ملنے والے سبق کو پیش کیا جائے گا۔

اقبال کے حالات زندگی: ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ اردو اور فارسی کے مشہور مفکر اور فلسفی شاعر گذرے ہیں۔ وہ 9 نومبر 1877ء کو موجودہ پاکستان کے صوبہ پنجاب کے مشہور شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباء واجداد کشمیری تھے۔ اقبالؔ کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ نور محمد نے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے انہیں مشہور شخصیت سید میر حسن کے حوالے کیا۔ اقبالؔ کے زندگی پر اپنے اس استاد کا بہت اثر رہا۔ اقبالؔ کی اعلیٰ تعلیم لاہور میں ہوئی۔ جہاں سے انہوں نے 1897ء میں بی اے اور 1899ء میں فلسفہ سے ایم اے کیا۔ اورنیشنل کالج لاہور میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ 1903ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ اور تین سال کے لئے یوروپ میں قیام کیا۔ لندن میں بیرسٹر لاء اور جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا عنوان Development of Meta Physics in Persia (ایران میں مابعد طبعیات کا ارتقاء) تھا۔ یہ مقالہ بعد میں لندن سے شائع ہوا۔ جرمن اور اردو میں بھی شائع ہوا۔ اقبالؔ 27 جولائی 1908ء کو لاہور واپس ہوئے۔ اور وکالت شروع کی۔ اس کے ساتھ لاہور میں فلسفہ کی تعلیم بھی دیتے رہے۔ بعد میں پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا اور وکالت کو جاری رکھا۔

اقبالؔ کو بچپن سے شعر گوئی سے دلچسپی تھی۔ اس زمانے میں آزادی ہند کی تحریک اپنی طفولیت کی منزل میں تھی۔ اقبالؔ نے

پر جوش قومی اور وطنی نظموں کے ذریعے اس زمانے میں ہندوستانیوں کو انگریزوں کے خلاف جدو جہد آزادی میں حصہ لینے اور انہیں انگریزوں کے خلاف متحد کرنا شروع کیا۔ ان کی نظمیں ''ترانہ ہندی' نیا شوالہ' پرندے کی فریاد' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' ہندوستان کی قومی شاعری کی بہترین مثال ہے۔ ان اثر انگیز نظموں کے ذریعے اقبالؔ نے قومی یکجہتی کا تصور پیش کیا۔ یورپ سے واپسی کے بعد اقبالؔ کے افکار اور خیالات میں بڑی تبدیلی آئی۔ اب ساری دنیا کے انسان ان کی شاعری کے مخاطب بن گئے۔ انہوں نے تمام انسانوں کو قوم نسل ملک اور زبان کے امتیازات سے بلند ہو کر بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس طرح انہوں نے اپنی شاعری کو اپنے خاص پیام اور تعلیمات کا ذریعہ بنایا۔ اقبالؔ نے لوگوں کو حرکت اور عمل کی تلقین کی۔ خودی' عشق' اور مرد مومن کا تصور پیش کیا۔ شاہین پرندے کو بہ طور علامت کے استعمال کیا۔ 1923ء میں حکومت کی جانب سے ڈاکٹر محمد اقبالؔ کو سر کا خطاب دیا گیا۔ اور اقبالؔ ہی کی فرمائش پر ان کے استاد سید میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ 21 اپریل 1938ء کو اقبالؔ کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اقبالؔ کی شاعری کے چار مجموعے بانگ درا' بال جبریل' ضرب کلیم اور ارمغان حجاز مشہور ہیں۔ اقبالؔ کے کلام کے دنیا بھر کی بیشتر زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اقبالؔ کا کلام فلسفیانہ بصیرت' شاعرانہ حسن اور اثر انگیزی کا ایک حسین امتزاج ہے۔

اقبال کی شاعری کی اہم خصوصیات: اقبالؔ کو ہم سے جدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ان کی وفات کے بعد ان کی حیات اور ان کے کارناموں پر کئی جلسے ہوئے تقریریں کی گئیں' اخباروں میں مضامین لکھے گئے خاص نمبر شائع کئے گئے اور ان کے پیغام کو عام کیا گیا۔ اقبالؔ ہم سے جدا ہوئے لیکن اپنی فکر و فلسفہ کے ساتھ ہمیشہ کیلئے ہمارے ساتھ زندہ جاوید ہو گئے اسی میں اقبالؔ کی مقبولیت کا راز چھپا ہوا ہے۔ عام آدمی سے اقبالؔ کے بارے میں پوچھا جائے تو کہے گا کہ اقبالؔ نے ہمیں ''قومی ترانہ'' جیسی نظم دی ہے جس سے وطن کی محبت اور جوش ولولہ پیدا ہوتا ہے ایک نقاد سے پوچھا جائے تو کہے گا کہ اقبالؔ نے اُردو شاعری کو فکر و فلسفہ دیا اور نوجوانوں کیلئے عمل کا پیغام دیا اور ان کا کلام ماضی کی یاد ہے اور مستقبل کا تصور ہے۔ ان کا کلام زندگی کا احساس دلاتا ہے عمل کیلئے راغب کرتا ہے اقبالؔ نے اپنی شاعری سے پیغمبری کی۔

اقبالؔ کو فلسفی کہنا ان کی بڑی توہین ہے کیونکہ فلسفی حقیقت کی خشک اور بے جان تفسیر کرتا ہے وہ کائنات کو اپنے ذہن سے سمجھتا ہے وہ مادّہ اور روح کی بحث میں الجھا رہتا ہے اور ہر جگہ عقل کو سامنے رکھتا ہے۔ اقبالؔ فلسفی اس لئے نہیں کہ انہوں نے عشق کو عقل پر فوقیت دی ان کا اپنا فلسفہ حیات ہے یہ فلسفہ حیات نہ تو فقیر کی جھولی کی طرح ہے جس میں ادھر اُدھر سے مانگ کر بھیک کے ٹکڑے جمع کئے جاتے ہیں نہ یہ خود رو ہے بلکہ اس میں ہمارے تمام سرمایہ ذہنی کی ترقی یافتہ شکل ملتی ہے۔ اقبالؔ نے مشرق اور مغرب کے حکماء اور مفکروں کے خیالات سے استفادہ کیا ہے ان کا مطالعہ وسیع ہے اور نظر گہری ہے مغربی مفکروں میں اقبالؔ نیٹشے اور برگسان سے متاثر ہیں اور مشرقی مفکروں میں جمال الدین افغانی' مجدد الف ثانی' اور بیدلؔ و غالبؔ کا بھرا اثر قبول کیا اقبالؔ نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ غلامی اور مایوسی کا دور تھا۔ لوگ خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے

تھے اور حرکت وعمل سے دور تھے۔ اس سے زندگی کی رفتار کم تھی صوفیوں کی تعلیمات لوگوں کو دنیا سے دور کر رہی تھی۔ اقبالؔ نے محسوس کیا کہ تعلیم کو عام کرتے ہوئے اور لوگوں میں حرکت وعمل کا جذبہ پیدا کرتے ہوئے انہیں خوابِ غفلت سے جگایا جاسکتا ہے انہوں نے محسوس کیا کہ عشق کی چنگاری جلا کر لوگوں کو کچھ کرنے کیلئے راغب کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے خودی کا نظریہ پیش کیا جس میں فرد کی تعمیر واصلاح ہوتی ہے اسی لئے خودی کے بارے میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبالؔ کہتے ہیں کہ خودی کی تعمیر واطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی سے ہوتی ہے۔ اقبالؔ کے فلسفہ میں حرکت وعمل کا پیغام اہم ہے خاموشی اور جمود سے نفرت کرتے ہیں اقبالؔ کے نزدیک شباب آرام کیلئے نہیں بلکہ کچھ کرنے کیلئے ہے اقبالؔ نے جہاں کہیں شاہین کا استعارہ استعمال کیا ہے وہاں انہوں نے لوگوں کو عمل کا پیام دیا ہے اقبالؔ کے مردِ مومن کی یہ پہچان ہیکہ وہ جنگ میں آگے بڑھ کر لڑتا ہے اور امن کی حالت میں سادگی کی زندگی گذارتا ہے اقبالؔ نے جہاں کہیں فرد کی اصلاح کی بات کہی ہے ان کا مقصد فرد کے ذریعہ سماج کی اصلاح ہے یعنی اقبالؔ کسی ایک فرقہ یا مسلک کے شاعر نہیں ہے بلکہ وہ تمام انسانوں سے خطاب کرتے ہیں۔ اور ان کا پیام ساری انسانیت کیلئے ہے۔

مغرب نے خودی کے فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے ترقی کی لیکن اطاعت الٰہی ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی کا منصب چھوڑ دینے سے مسلمان روحانی طور پر پیچھے رہنے لگا۔ اقبالؔ روحانی ترقی پر بھی زور دیتے ہیں کیونکہ روحانی نظام کی بنیاد توحید پر قائم ہے اور توحید کا فلسفہ دنیا میں رہنے والے تمام انسانوں کو رنگ ونسل وذات پات ادنیٰ واعلیٰ کی قید سے آزاد کرتے ہوئے ایک رشتہ میں پروتا ہے۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ وطن کی آزادی پر زور دیا ہے کیونکہ غلامی انسان کی تمام خوبیوں کو مٹا دیتی ہے اور آزادی سے ترقی میں مدد ملتی ہے اقبالؔ آزادی کے ساتھ مساوات پر بھی زور دیتے ہیں وہ انسانوں کو مختلف طبقوں میں بانٹنے کے مخالف ہیں وہ انسانوں کے حقوق کی علم برداری کرتے ہیں وہ مزدور کا حق دلانا چاہتے ہیں اور انسانوں کے بنائے ہوئے مختلف ازم (Isms) کو ناپسند کرتے ہیں۔

اقبالؔ نے اپنی نظموں میں ابلیس کی تعریف کی ہے کیونکہ اقبالؔ محسوس کرتے ہیں کہ ابلیس ہمیشہ انسانوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور انہیں خدا کی نافرمانی پر اکساتا رہتا ہے ابلیس کے بہکاوے میں نہ آتے ہوئے لوگ نیکی کی طرف راغب ہوتے ہیں اس طرح اگر ابلیس نہ ہوتا تو لوگ کچھ نہیں کرتے مجموعی طور پر اقبالؔ انسان کو حرکت وعمل کا پیام دیتے ہوئے اسے بلند مقام حاصل کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ یہی ان کے فلسفہ خودی کی روح ہے وہ مسلسل پرواز تلاش پیہم اور آگے بڑھنے کی بے پناہ آرزو کے قائل ہیں۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری کو اپنے فلسفہ اور خاص پیام تعلیمات کا ذریعہ بنایا وہ بلاشبہ شاعر مشرق کے خطاب کے مستحق ہیں ان کی شاعری کا اثر بعد کے اُردو اور فارسی شاعروں پر پڑا۔

اقبال کی منتخب نظمیں ایک مطالعہ:

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا چلنا، مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کش سفر سب
تارے، انساں، شجر، حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا
کہنے لگا چاند، ہم نشینو
اے مزرع شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

نظم کا تنقیدی جائزہ: اقبالؔ کی ایک مشہور نظم ''چاند اور تارے'' ہے۔ اس نظم میں چاند اور تاروں کی باہمی گفتگو کے ذریعہ اقبالؔ نے وقت کا فلسفہ اور تخلیق کائنات کا مقصد پیش کیا ہے۔ اور کائنات کی تمام اشیاء اور انسان کے سفر کے انجام سے آگاہ کرایا ہے۔ تارے اور چاند بے جان اشیاء ہیں لیکن وہ انسانوں کی طرح گفتگو کرتے دکھائے گئے ہیں۔ اردو میں بے جان اشیاء کی گفتگو کو تمثیل کہتے ہیں اس کا مقصد انسانوں کو سبق دینا ہے۔

''چاند اور تارے''، مختصر نظم ہے جو دو بندوں پر مشتمل ہ۔ ہر بند میں چھ اشعار ہیں پہلے بند میں چاند سے تاروں کا استفسار ہے اور دوسرے بند میں ستاروں کے سوالات پر چاند کا حکمانہ جواب دیا گیا ہے اقبال کی دیگر نظموں کی طرح اس نظم میں بھی انسانوں کیلئے کئی سبق آموز باتیں پیش کی گئی ہیں۔ اور انہیں حرکت و عمل کا پیام دیا گیا۔ نظم کے آغاز پر اقبال کہتے ہیں کہ آسمان پر موجود تارے صبح کے ڈر سے چاند سے پوچھتے ہیں کہ آسمان پر ایک عرصے سے وہی منظر ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اور روز آنہ صبح شام چمکتے چمکتے ہم تھک گئے ہیں۔ ہم ایک عرصے سے روشنی دینے کا کام کررہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ نہ صرف ہم بلکہ اس جہاں اور کائنات کی ہر شئے بے چین و بے تاب لگ رہی ہے اور کسی کو سکون دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ مسافر لوگ کسی نہ کسی سفر کی دشواریوں میں مبتلا ہیں۔ تارے' انسان' درخت' پتھر غرض کائنات کی ہر شئے سکون کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دے رہی ہے۔ کیا اس کائنات کا اور اس میں موجود چیزوں کا سفر کبھی ختم ہوگا۔ کیا کبھی انہیں سکون ملے گا کیا کبھی اس بے چین سفر کی منزل آئے گی۔

چاند سے تاروں کے ان فکر انگیز سوالوں کے ذریعہ اقبال نے کئی اہم باتیں پیش کی ہیں انسانی مشاہدے میں آسمان پر تارے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں اور چاند بڑا دکھائی دیتا ہے۔ تارے ہمیشہ چمکتے رہتے ہیں۔ لیکن جب صبح ہوتی ہے تو سورج کی روشنی کی وجہہ سے اُن کی روشنی چھپ جاتی ہے اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ اس لئے اقبالؔ نے تاروں کو ڈرا ہوا اور سہما ہوا بتایا ہے۔ تارے چاند سے اسلئے سوال کتے ہیں کہ رات کے وقت آسمان پر اُن کے درمیان وہ بڑا دکھائی دیتا ہے اور اُس کی روشنی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ انسانوں میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ کم جاننے والے لوگ زیادہ پڑھے لکھے اور علم رکھنے والے لوگوں سے سوال کرتے ہیں چنانچہ تارے چاند سے سوال کرتے ہیں دراصل تاروں کا سوال انسانوں میں موجود مفکرین کا سوال اپنے خدا سے ہے کہ اے خدا یہ انسانیت کا سفر کب ختم ہوگا۔ یہ دنیا کا سفر کب ختم ہوگا۔ اس دنیا میں ہر چیز سفر میں دکھائی دیتی ہے سب لوگ اپنے اپنے مقصد زندگی پر چلے جارہے ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے کہ سب کو کسی منزل کی تلاش ہ وہ منزل کیا ہے؟ اس بے چینی و بے قراری کے سفر کا انجام کیا ہے؟ اقبالؔ نے ''کام اپنا ہے صبح و شام چلنا'' سے یہ واضح کردیا کہ کائنات کی ہر مخلوق کو اس کی پیدائش کے مقصد پر عمل کرنا ہوگا۔ انسان بھی خدا کی پیدا کردہ مخلوق ہے۔ اور اس کے پیدا کرنے والے خدا نے اس کا مقصد اطاعت اور بندگی بتایا ہے۔ اب انسان یہ بھی سوچ لے کہ کیا وہ زندگی کے سفر میں اپنی پیدائش کے مقصد پر چل رہا ہے۔ اگر نہیں چل رہا ہے تو یہ نافرمانی کی علامت

ہے جس کا نتیجہ دنیا و آخرت میں نقصان کا ہونا ہے۔ بحر حال اقبال نے زندگی کے اس لامتناہی سفر کے بارے میں تاروں کے سوالات کے ذریعہ یہ پیغام بھی دیا ہے کہ انسان کو اپنے مقصد تخلیق کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ اور کبھی کبھی کائنات کے بارے میں غور کرنا چاہئے اس سے زندگی کے پوشیدہ اسرار سے آگہی ہوسکتی ہے۔

نظم کے دوسرے حصے میں اقبال نے تاروں کے سوالات پر چاند کے جوابات پیش کئے ہیں۔ چاند عالمانہ جواب دیتے ہوئے تاروں کو ہمنشینو سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم لوگ رات میں چمکتے ہو اس جہاں میں زندگی حرکت میں پوشیدہ ہے اور یہ دنیا کا سلسلہ اور کائنات کا سفر قدیم زمانے سے جاری ہے۔ زمانے مثل گھوڑا ہے جو دوڑ رہا ہے زمانے کی اس حرکت کے پیچھے لوگوں کی طلب' ضروریات ہیں۔ ہر مخلوق کو کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہے۔ اور ان ضرورتوں کی تکمیل کیلئے جو دوڑ لگ رہی ہے جو حرکت ہو رہی ہے اس سے اس کائنات کا کارخانہ چل رہا ہے۔ اگر ضرورت نہ ہوتی تو لوگ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے اور اس کائنات کا نظام ٹھپ پڑ جاتا۔ اس دنیا میں کسی ٹھہرنا نہیں ہے۔ یعنی جس کی حرکت ختم ہوگئی وہ مردے کی مانند ہے اسلئے اس کائنات کے سفر میں جو چل رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھ گئے ہیں اور جو ٹھہر گئے ہیں پیچھے سے آنے والوں کے پیروں تلے کچلے گئے ہیں۔

اس کائنات کا آغاز عشق پر ہوا تھا یعنی کائنات کی ہر مخلوق اپنے خلق سے ملنے کیلئے بے چین اس کے عشق میں سرگرداں حرکت کر رہی تھی۔ اور حرکت کرتے کرتے یہ اپنے خلق سے جا ملے گی جب وہ اپنے خالق سے جا ملے گی تب اُسے اپنے خالق کے حسن کا دیدار ہوگا۔ تو ہر مخلوق کو چین و قرار آجائے گا اور اس کائنات کا سفر ختم ہو جائے گا۔

چاند کے فلسفیانہ جوابات سے اقبال نے انسانوں کو کئی اہم سبق دیئے ہیں سب سے پہلی بات یہ واضح کی کہ اگر کوئی کسی سے سوال کرے تو اُسے اچھے انداز میں جواب دینا چاہئے۔ اور جواب تسلی بخش ہونا چاہئے۔ چنانچہ چاند تاروں کو ہمنشین قرار دیتے ہوئے انسانوں کو بھی آپسی بھائی چارہ کا سبق دیتا ہے۔ تارے رات میں چمکتے ہیں یعنی اُن کی چمک ظاہر ہونے کیلئے ات کی سیاہی ضروری ہے۔ اسی طرح انسان کی نیکی ظاہر ہونے کیلئے سامنے برائی کی مثال ہونا ضروری ہے۔ یہ کائنات کا اُصول ہے چاند کے ذریعہ اقبال کہتے ہیں کہ حرکت و عمل سے ہی زندگی ہے اسطرح وہ بے عمل انسانوں کو خبردار کر رہے ہیں کہ بے عملی انفعالیت کچھ کام نے کرنا موت کی نشانی ہے۔ انسان زندہ ہے تو اُس کیلئے کچھ نہ کچھ کام کرنا ضروری ہے پھر اقبال کہتے ہیں کہ ایک قدیم زمانے سے زندگی اور حرکت و عمل کا فلسفہ چلتا آرہا ہے۔ انسان کو اس کائنات کے آغاز و انجام کا قطعی علم نہیں ہے یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ اقبالؔ انسانی ذہنوں کو سمجھانے کیلئے آگے کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کو پیٹ کی بھوک دی۔ دیگر جاندا بھی زندہ رہنے کیلئے جستجو کرتے ہیں اور بے جان چیزیں خدا کے حکم کے مطابق لوگوں کے کام آتی ہیں۔ اسطرح انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے حرکت کرتا ہے ایک انسان کی ضرورت دوسرے سے پوری ہوتی ہے اور کائنات کا نظام چلتا رہتا ہے اقبالؔ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی نہیں ٹھہرتا۔ اگر جو رک گیا سمجھو مر گیا کیونکہ حرکت و عمل کے بغیر بے جان چیز کسی کام کی نہیں رہتی انسان کے دل کی حرکت رک جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ پانی بہتا رہے تو صاف رہتا ہے رک جائے تو گندہ ہو جاتا ہے۔ پتے درخت سے جڑے رہیں تو ہرے بھرے رہتے ہیں درخت سے

الگ ہوجائیں تو سوکھ جاتے ہیں اسطرح اس دنیا میں قرار کا مطلب موت ہے اس لئے انسان کو مسلسل حرکت وعمل جاری رکھنا چاہئے۔اور زندگی میں منزل مقصود حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔انسان اگر زندگی کے کاروان کا ساتھ دیتا رہے اور عمر کی ہر منزل پر مقررہ کام کرتا رہے تو اُس کی زندگی کامیاب ہوگی۔ورنہ وہ عمر کے کسی مرحلہ پر سستی اور کاہلی کا اظہار کرے اور ٹھہر جائے تو پیچھے سے آنے والا لوگوں کا قافلہ اُسے کچل دے گا۔انسان زمانے کے ہاتھوں کچلا جائے گا۔اسلئے انسان کو ہمیشہ وقت کا ساتھ دینا چاہئے اُسے ہر کام آج انجام دینے کی کی کوشش کرنی چاہئے۔نظم کے آخر میں اقبالؔ زندگی کے سفر کے انجام کے بارے میں فلسفیانہ انداز میں کہتے ہیں کہ انسان اور کائنات کے آغاز سے اس بے چینی کا آغاز ہوا ہے جسے عشق کہتے ہیں اور اس عشق کا انجام اپنے خالق کا دیدار ہے یہ اس کائنات کے سفر کی انتہاء ہوتی ہے اور اس کائنات کا خلق سب سے حسین ہے۔اور اس کے حُسن کا دیدار کرنے کے بعد انسان اور تمام مخلوقات کی ہر طرح کی بے چینی ختم ہوجائے گی۔اور سب کو قرار آجائے گا۔

نظم کا پیغام: اقبال نے نظم ''چاند اور تارے'' کے ذریعہ انسانوں کو حرکت وعمل کی تلقین کی ہے اور اس راز سے پردہ اُٹھایا ہے کہ زندگی کا سفر عشق پر مبنی ہے۔اور اس سفر میں حرکت وعمل کے ذریعہ مسلسل آگے بڑھتے ہوئے انسان کو اپنی دنیا اور آخرت کو کامیاب بنانا ہے اور حقیقی حسن یعنی دیدار الٰہی کو پانے تک مسلسل جدوجہد جاری رکھنی چاہئے۔ بے عملی موت کی نشانی ہے اس سے انسان کی دنیا اور آخرت دونوں برباد ہوتے ہیں۔اسطرح اقبالؔ کی یہ نظم انسانوں کیلئے حرکت وعمل کا پیام پیش کرتی ہے۔

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر وحرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
آ غیرت کے پردے ایک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

نظم کا مطالعہ: اقبال ایک سچے محبّ وطن شاعر تھے۔ اُنھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ ہندوستانیوں میں آپسی اتحاد اور وطن سے محبت کا جذبہ کو پیدا کیا۔ نظم کے آغاز میں اقبال برہمن کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ تیرے بُت خانے کے بُت پرانے ہوگئے کیونکہ ان بتوں کی پوجا کرتا رہا۔ لیکن تو اپنے لوگوں سے ہی دشمنی کررہا ہے۔ اقبال کا اشارہ ہندوستان میں ویدک سے دور سے چلی آرہی مذہبی فرقہ بندی کی طرف ہیکہ ہندو قوم میں لوگوں کو ذات پات اور فرقوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ اقبال نے محسوس کرلیا تھا کہ اگر ہمیں انگریزوں سے وطن کی آزادی کی جنگ لڑنا ہے۔ تو سب سے پہلے اپنے آپ کو متحدہ کرنا ہوگا۔ لوگ اگر ذات پات اور فرقوں میں بٹے رہے تو وہ متحد نہیں ہوسکتے۔ اور آزادی کو جنگ نہیں لڑی جاسکتی۔ اقبال برہمن کو اشارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ہندو قوم اور اُن کی فرسودہ مذہبی روایات پر کڑی تنقید کی اور انھیں متحد کرنے کا پیغام دیا ہے۔ ہندوستان میں کئی سو سال سے مسلمان بھی رہتے آئے ہیں۔ مسلمان اس ملک کا اٹوٹ حصہ ہے۔ لیکن وہی فرقہ بندی کی مسلمان مذہبی رہنماؤں پر تنقید کرتے ہیں۔ اسلام نے رواداری اور مساوات کا سبق پڑھایا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے مفادات کی خاطر مسلمانوں کو بھی تقسیم کرنے لگے۔ جس سے ہندوستانی قوم کئی گروپوں میں بٹ گئی تھیں۔ اس لئے اقبال ہندو مسلم مذہبی رہنماؤں پر زور دیتے ہیں کہ اگر ہمیں ہندوستان کی آزادی حاصل کرنا ہو تو سب سے پہلے ذات پات اور فرقہ بندی سے اوپر اُٹھ کر ایک متحدہ قوم بننا ہے۔ تب ہی ہم انگریزوں کو شکست دے سکتے ہیں۔

وطن کی محبت سے سرشار شاعر برہمن اور واعظ عدم رہبری سے مایوس ہوجاتا ہے اور دونوں کو پیچھا چھوڑ دیتا ہے وہ متحرک مورتی کو خدا سمجھنے والوں پر تعجب کرتا ہے اور اپنے وطن کے ہر ذرے کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔ وطن کا ذرہ ہو یا کائنات کی کوئی مخلوق وہ خدا نہیں ہوسکتی۔ یہاں شاعر اس بات کی اہمیت دلا رہا ہے کہ ہمیں وطن کے پیڑ پودوں، ندی، نالوں، دریا، پہاڑ، گاؤں اور شہر اور یہاں کے لوگوں سے سچی محبت رہے تو ہم آزاد رہنے کی فکر کرسکتے ہیں اور اگر ہماری غفلت کی وجہ سے وطن غلام ہوجائے تو آزادی کی جدوجہد شروع کرسکتے ہیں۔

نظم کے دوسرے بند میں اقبال غفلت اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے پست ہمت اور مایوس لوگوں کو غیرت دلاتے ہوئے اُن سے کہتے ہیں کہ لوگ غفلت کی نیند سے جاگے دلوں کے نفاص کو مٹا کر متحد قوم بن جائے دل ہمارے وطن کی طرح جولانی کے سبب ویران اور سونا پڑا ہوا ابھم دل میں محبت کی روشنی جگانے اور دل کو ایک مقدس عبادت گاہ بنائے۔ اقبال نے دل کو عبادت گاہ کا نام شیوالہ رکھا جیسے پوجا کے مندر اونچے بتائے جاتے ہیں اور اُس کے گنبدوں کا سنہری کلس لگائے جاتے ہیں۔ شاعر دل کے مندر کو پاک عظیم اور مقدس بنانا چاہتا ہے۔ اس دل کے مندر میں مقدس گیت گانے کی تلقین کی جاتی۔ اقبال اس دل کے مندر میں آنے والے ہندوستانی قوم کو محبت کی شراب پلانا چاہتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو بھکتوں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُن کے گیت

میں طاقت اور امن ہے۔اس طرح شاعر نظم کے آخر میں کہتے ہیں وطن کے رہنے والوں کی آزادی محبت سے رہنے میں مضمر ہے۔

نظم کا پیغام: اقبال نے نظم نیا شیوالا میں ہندو قوم کی مذہبی نشانیوں مندر، مورت، تیرت، کلس، منتر، پوجاری، بھگت اور مکتی جیسے استعارے استعمال کرتے ہوئے تمام ہندوستانیوں کو اتحاد کو یہ پیغام دیا کہ ہندوستان کی آزادی کو برقرار رکھنے میں ہمارے مذہبی ادارے مسجد و مندر ناکام ہو گئے ہیں۔ کیونکہ انھیں چلانے والے وارد و پوجاری مذہب کی حقیقی روح سے ہٹ گئے اس لئے شاعر مسجد و مندر کی قید سے آزاد ہو کر لوگوں کو اپنے دل کو عبادت گاہ بنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور دلوں میں محبت و اتحاد کی روشنی جگاتے ہوئے وطن کی آزادی حاصل کرنے اور اُسے برقرار رکھنے کی تنقید کرتے ہیں۔ نیا شیوالہ نظم سے اقبال نے ہندوستانیوں میں قومیت کے جذبہ کو پروان چڑھایا۔ اقبال کی یہ نظم آج بھی فرقہ پرستی کے زہریلے ماحول میں ہندوستانیوں کو امن و آشتی کا پیغام دیتی ہے۔

فنون لطیفہ

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا!
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرہ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

نظم کا مطالعہ: اقبالؔ کی تمام شاعری لوگوں کو حرکت و عمل کا پیام دیتی ہے۔ اقبال نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ حرکت زندگی ہے۔ اگر انسان کے اعمال و افعال جذبات و خیالات میں جمود پیدا ہو گیا تو وہ مُردوں کے مانند ہے۔ انسان کا اس دنیا میں قیام آرام کیلئے نہیں بلکہ کچھ کرنے کیلئے ہے چنانچہ اقبالؔ اپنی اس نظم ''فنون لطیفہ'' میں بھی انسانوں سے مخاطب ہیں۔ اور اُن سے کچھ طلب کر رہے ہیں۔ انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا اور اس دنیا میں عمل کرتے ہوئے اپنی دنیا اور آخرت کو سنوارنے کا موقع دیا۔ زندگی انسان کو ملنے والی سب سے بڑی نعمت ہے۔ انسان کے فائدے کیلئے خدا نے کائنات بنائی۔ جس میں چاند، سورج، ستارے، پہاڑی، ندی، نالے، پھل پھول اور دیگر مخلوقات کو پیدا کیا۔ انسان کا خالق خدا چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق دنیا میں رہ کر اُسے بھول نہ جائے بلکہ کائنات کی چیزوں اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے پس پردہ خدا کی حکمت کو محسوس

کرے۔اور دنیا کے ہنگاموں کو خدا سے منسوب کرلے۔خدا رازق ہے اور وہ انسان کے بشمول زمین پر موجود چھوٹی اور بڑی اٹھارہ ہزار مخلوقات کو اپنے غیبی خزانے سے بھرپور رزق دے رہا ہے۔انسان سماجی جانور ہے وہ سماج کے بغیر رہ نہیں سکتا۔اور سماج میں اپنے کسی فن، ہنر یا پیشہ سے دوسروں کے ساتھ تعاون کرتا ہے اور اس کے بدلے میں ملنے والی اُجرت سے اپنا پیٹ پالتا ہے اب انسان یہ سوچے کے میں نے اپنی عقل سے اپنے ہنر سے اپنی محنت سے کام کرکے یہ اُجرت کمائی ہے اور اس کے پیچھے کسی کا دخل نہیں ہے تو انسان کی یہ سوچ بالکل غلط ہے۔انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اسے ملنے والی زندگی خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے۔خدا نے انسان کو سوچنے کیلئے عقل دی کام کرنے کیلئے ہاتھ دئے۔ہنر سکھایا تب انسان کچھ کرنے کے قابل ہو۔اگر انسان کے پاس خدا کی طرف سے عطا کردہ یہ نعمتیں نہ ہوتیں تو وہ کچھ بھی کرنے کے لائق نہیں تھا۔دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔وہ خدا کی مرضی اور خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔خدا کی یہ عادت ہے کہ وہ کرشماتیطور پر کام نہیں کرتا بلکہ وہ ہر کام کیلئے ایک ذریعہ رکھتا ہے بارش بادلوں سے ہوتی ہے کھیتی زمین سے اُگتی ہے گرمی کا ذریعہ سورج ہے۔اسی طرح رزق بھی محنت سے ملتا ہے۔اب خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان اُس کو پہچاننے کیلئے کائنات کی ان چیزوں اور ان انتظامات میں غور کرے۔اسی لئے اقبالؔ اپنی نظم ''فنون لطیفہ'' کے پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ انسان اپنی عقل، اپنے علم اور اپنے مطالعہ سے عقل مند، عالم، فاضل، دانشور اور مفکر ہوگیا۔وہ نئی نئی ایجادات کرکے کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھانے کا دعویٰ کرنے لگا ہے۔انسان اونچی نظر والا ہوگیا ہے اس کی نظر کا ذوق بھی خوب ہے۔وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے دور کی نظر ڈال رہا ہے اور کوشش اور جستجو سے ہر مسئلہ کا حل دریافت کررہا ہے۔لیکن اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان شئے میں طاقت اور کرشمہ دیکھ رہا ہے۔اس کی حقیقت کی طرف نظر نہیں ڈال رہا ہے۔انسان کسی بیماری کا علاج دریافت کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اس نے علاج دریافت کرکے بڑی کامیابی حاصل کی ہے لیکن انسان اس حقیقت سے غافل ہے کہ اچھے انسان کو بیمار بھی خدا کرتا ہے اور خدا ہی انسان کو بیماری کے علاج کی دوا ڈھونڈے کیلئے رہنمائی کرتا ہے۔اس کے باوجود دوا میں شفا نہیں ہوتی۔یہ انسانوں کا مشاہدہ ہے کہ ایک بیماری میں کئی لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ڈاکٹر سب کو ایک قسم کی دوائی دیتا ہے کچھ لوگ اس دوا سے شفایاب ہوتے ہیں اور کچھ لوگوں پر وہ دوا اثر نہیں کرتی۔اس سے معلوم ہوا کہ شفا دوا میں یا ڈاکٹر کے پاس نہیں بلکہ شفا خدا کے حکم میں ہے۔اس لئے عقل مند دانشور انسان کو خدا کی حکمت جان کر سب سے پہلے اپنے مسئلہ کے حل کیلئے اس سے رجوع ہونا چاہئے اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے خدا کی حکمت اور اس کے حکم کو محسوس کرنا چاہئے۔تب انسان کے بہت سے مسائل کا حل ممکن ہے۔

نظم کے دوسرے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان ہنر سیکھتا ہے اپنی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کیلئے ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے کہ اس کی زندگی چین وسکون سے گذر جائے۔لیکن مشاہدہ ہے کہ دنیا کے تمام علوم وفنون انسان کو حقیقی چین وراحت نہیں دے سکتے کیونکہ انسان کو اس زندگی میں قرار نہیں ہے۔انسان کا فن اور ہنر اس کی زندگی میں کام آسکتا ہے مرنے کے بعد قبر کی زندگی، حشر کا میدان اور آخرت کی ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی میں دنیا کے یہ فنون کام نہیں آتے۔خدا رزاق ہے اس خیال کو دل میں رکھتے ہئے انسان کو اتنی کوشش کرلینا چاہئے کہ اس کی دنیاوی ضرورتیں پوری ہوجائیں۔اس کے ساتھ انسان کو ایسا علم سیکھنا چاہئے کہ اس پر عمل کرتے ہوئے انسان اپنی دنیا وآخرت کو کامیاب نا سکے۔اس کیلئے انسان کو ہمیشہ اطاعت الہیٰ کے تحت زندگی گذارنا ہوگا۔

اقبالؔ شعر کے دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کہ چنگاری کی چمک مختصر اور عارضی ہوتی ہے۔چنگاری آگ نہیں ہوسکتی اس طرح چنگاری کی مثال کے طور پر انسان نماز، روزہ، زکوۃ، حج جیسی عبادتوں کے تحت کچھ نیک اعمال کرکے یہ نہ سوچے کہ یہ عبادتیں اس کی دنیا وآخرت کی زندگی میں کامیابی کی ضمانت ہوں گی۔بلکہ انسان کو مکمل آگ بننے کیلئے اپنے آپ کو خدا کیلئے وقف کردینا ہوگا۔اور زندگی کا ہر عمل حکم خداوندی اور طریقہ رسول اللہ ﷺ کے مطابق کرنا ہوگا۔

نظم کے تیسرے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان کا دل مثل دریا ہے۔ دریا میں طوفان آنے اور موجوں کے اٹھنے کیلئے بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔ چھوٹا سا صدف موتی دریا میں ہلچل پیدا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح انسان کے دل میں نیکی کے چھوٹے موٹے جذبات ہوتے ہیں اور یہ جذبات انسانوں کو عبادت کی طرف راغب کرسکتے ہیں لیکن انسان میں انقلابی تبدیلی آئے اور وہ خود اور اپنے گھر، سماج اور دنیا میں بڑی تبدیلی لائے اس کیلئے دل میں جذبات کو طوفان اٹھنا ضروری ہے۔ تب ہی انسان حرکت وعمل کے ذریعہ اپنی ذات میں اور اپنے سماج میں انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔

نظم کے اگلے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ گیت شاعر بھی گاتا ہے۔ اور نغمہ بلبل بھی سناتی ہے دونوں کے نغمے اچھے لگتے ہیں۔ اسی طرح باغ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بھی سائیں سائیں کرتی ترنم پیدا کرتی ہیں لیکن ہوا کبھی شدت اختیار کرتے ہوئے چمن کو اجاڑ دیتی ہے اور نقصان پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان کو ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے جس سے اُسے غم اور پریشانی ہو۔

نظم کے آخری شعر میں اقبالؔ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کو ایسا ہنر سیکھنا چاہئے جس میں اُسے مہارت حاصل ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے عصاء سے معجزات ظاہر کرتے تھے۔ پتھر پر مارتے تو پانی کے چشمے جاری ہوجاتے۔ پانی پر مارتے تو راستے بن جاتے اسی طرح اقبالؔ انسان سے اپنے ہنر کی مہارت سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ انسان بھی اپنے ہاتھ سے اور اپنے ہنر اور فن سے معجزے دکھائے۔ آج مغربی ممالک کے لوگ حرکت وعمل کے ذریعہ بڑی بڑی عمارتیں، پراجکٹس بنارہے ہیں۔ خلاء میں سفر کررہے ہیں اور ایسے کام کررہے ہیں جس سے عقل حیران رہ جائے۔ اسی لئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ بغیر حرکت وعمل کے کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ اور کوئی قوم جب ترقی کرتی ہے تو اس کے فن اور ہنر سے معجزے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

نظم کا پیغام: اقبالؔ نظم ''فنون لطیفہ'' سے لوگوں کو حرکت وعمل کا پیام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے خدا کی مرضی سے ہورہا ہے۔ انسان کو کائنات کی چیزوں میں غور کرتے ہوئے خدا کی قدرت کو پہچاننا چاہئے اور وہ جو کچھ کام کرے اُس کے پیچھے اپنی صلاحیت نہ سمجھے بلکہ خدا کی مرضی جانے۔ انسان ایسا کام کرے جس سے اُس کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔ دنیا میں وہی قوم ترقی کرتی ہے جو اپنے کام سے انقلابی تبدیلی لاسکتی ہے۔ اقبالؔ کی یہ نظم انسان کو دائمی ہنر سیکھنے کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

ماں کا خواب

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے میرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جارہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے میرا بال بال
قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پاکے آگے بڑھی
تو دیکھا قطار اک لڑکوں کی تھی

زمردسی پوشاک پہنے ہوئے
دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جان
مجھے چھوڑ کر تم آ گئے کہاں
جداء میں رہتی ہوں میں بے قرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی
جو بچے نے دیکھا میرا پیچ و تاب
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی میری
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی میری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا
دیا پھر دکھا کر کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

نظم کا مطالعہ: اقبال کی نظم "ماں کا خواب" ولیم بارنس کی نظم The Mother's Dream کا پابند ترجمہ ہے۔ گو اقبال نے اصل نظم کے مقابلے میں کچھ زیادہ تفصیلات پیش کی ہیں پھر بھی اس کو پابند ترجمہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ترجمہ کو صرف اقبال کا مکمل اور کامیاب ترجمہ کہہ سکتے ہیں، بلکہ انگریزی سے اردو میں جو کامیاب ترجمے ہوئے ہیں ان میں اس کو با آسانی شریک کر سکتے

ہیں۔اقبال نے اس نظم میں ایک ماں کے خواب کے ذریعے اس کے بچے کی جدائی اور خواب میں بچے کی کیفیت کو جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔ایک ماں کا بچہ چھوٹی عمر میں دنیا سے گذر گیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ جو بچے کم عمری میں مر جاتے ہیں وہ بچوں کی جنت میں داخل کر دئے جاتے ہیں۔اور ان کے سبب ان کے والدین کو بھی جنت ملتی ہے۔لیکن دنیا میں بچے کی جدائی کے سبب ماں بے چین رہتی ہے۔اسی بے چینی میں ایک رات وہ خواب دیکھتی ہے کہ کسی اندھیری جگہ کچھ بچے ایک قطار میں ہیں۔ان سب کے ہاتھوں میں چراغ ہیں۔اور اس قطار کے سب سے آخر میں اس کا بیٹا ہے جو خاموش اور غمزدہ ہے۔اس کے ہاتھ میں چراغ بجھا ہوا ہے۔بچے کو دیکھتے ہی ماں اس سے شکوہ کرتی ہے کہ ہمیں چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔کچھ ہماری پرواہ بھی نہیں کی اور دنیا میں ہمیں غمزدہ چھوڑ آئے۔ تمہارے جدائی سے جو آنسو نکلتے ہے وہ ایک لڑی کی مانند بہتے رہتے ہیں۔بچہ ماں کی باتیں سن کر کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر کہتا ہے کہ تم یہ چراغ بجھا ہوا دیکھ رہی ہو نا یہ تمہارے آنسوؤں کے سبب بجھ گیا ہے۔بچہ ماں سے کہنا چاہتا ہے کہ میں یہاں خوش ہوں لیکن تمہاری یادوں سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

نظم کا پیغام: اقبال نے نظم میں ماں کے جذبات کو پیش کیا ہے۔دنیا کی تمام مائیں اپنے بچوں سے محبت رکھتی ہیں۔وہ نہیں چاہتیں کے ان کی اولاد کو کچھ دکھ درد ہو۔بچہ جنت میں ہے لیکن بچے کو احساس ہے کہ ماں کے رونے کے سبب اس کی خوشیوں کا چراغ بجھ گیا ہے۔یہ نظم اولاد کی جدائی پر ماں کے غم کو پیش کرتی ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

نظم کا مطالعہ: بچے کی دعا اقبال کی مشہور نظم ہے۔اس نظم کے ذریعے اقبال نے بچوں کی تربیت کی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ہر ضرورت کی تکمیل کے لئے اپنے رب حقیقی اللہ سبحانہ وتعالی کے حضور دعا گو ہوں۔اسی کے ساتھ ساتھ اقبال نے بچوں کو یہ بھی تربیت دی ہے کہ ہمیں اپنے رب سے دعا مانگتے رہنا چاہئے۔بچے کی دعا کے ذریعے اقبال نے بچوں کو دعا کے اخلاق بھی سکھائے ہیں۔بچہ دعا کرتا ہے اس کی زندگی مثل شمع ہوجائے۔شمع خود جلتی ہے لیکن دوسروں کو روشنی دیتی ہے۔اسی لئے بچہ کہتا ہے کہ میں زندگی میں انسانیت کی بھلائی کا ایسا کوئی کام کر جاؤں جس سے دنیا کے اندھیرے دور ہوجائے۔اس طرح کی تربیت بچوں کے لئے ضروری ہے کہ سب تو اپنے لئے جیتے ہیں لیکن ہمیں دوسروں کی بھلائی کے کام کرنے کے لئے جینا چاہئے۔بچہ اپنے وطن کا مستقبل ہے اس لئے وہ چاہتا ہے اسے وطن سے محبت ہو اور اس کی وجہ سے وطن کی زینت بڑھے۔جس طرح باغ کی زینت پھول سے ہے اسی طرح بچہ وطن کا پھول بننا چاہتا ہے۔بچہ پروانے کی مانند اپنی زندگی چاہتا ہے۔پروانہ شمع پر جان دیتا ہے بچہ علم کی شمع سے محبت رکھنا چاہتا ہے۔وہ غریبوں کی حمایت کرنا چاہتا ہے۔دردمندوں سے محبت کرنا چاہتا ہے۔وہ اللہ سے دعا گو ہے کہ اللہ اسے برائیوں سے محفوظ رکھے اور جو راستہ نیکی والا ہے اس پر اسے چلائے۔

نظم کا پیغام: نظم بچے کی دعا کے ذریعے اقبال نے تمام بچوں کو یہ سبق دیا ہے کہ وہ اپنے بچپن سے ہی اللہ کی مدد کے ساتھ زندگی کی سفر میں آگے بڑھنے والے بنیں۔

قطعہ اقبالؔ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں
شائد کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

قطعہ کا مطالعہ: اقبالؔ اس قطعہ میں کہتے ہیں کہ میرا انداز بیان نہ جوشیلا ہے نہ شوخ ہے۔میں سیدھے انداز میں بات کہہ رہا ہوں۔بعض لوگ اپنے مخصوص طرز بیان سے اس طرح بات پیش کرتے ہیں کہ سننے والوں کو بات اچھی لگتی ہے لیکن اس کا اثر دل پر نہیں ہوتا۔اور نہ بات اسے تبدیل ہونے پر مجبور کرتی ہے۔اس لئے اقبال پہلے ہی کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی بات کو اثر دار بنانے کیلئے اُس میں شوخی کا عنصر شامل نہیں کر رہا ہوں۔لیکن چونکہ اصلاحی جذبے کے تحت وہ بات پیش کر رہے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ مجھے اُمید ہیکہ پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دل میں میری بات اُتر جائے۔اس طرح اقبال تمام مصلحین قوم، واعظین اور

علمائے کرام ومقررین کو بنیادی اُصول بیان کررہے ہیں کہ اصلاح کی بات سیدھے سادھے واضح انداز میں کہنی چاہئے اور اُس میں نمک مرچ لگا کر شوخی کے ساتھ اُسے پیش نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے بات کانوں کو تو بھلی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا اثر دل پر نہیں ہوتا اور اصلاح کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے اقبال کہہ رہے ہیں کہ وہ جو بات کہنے جارہے ہیں سادھے انداز میں دوٹوک طریقے سے کہہ رہے ہیں۔ یہ بات بیان کرنے کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح ہے۔ اس لئے وہ اُمید کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کی بات اُتر جائے اور وہ اپنے رویہ میں تبدیلی لاتے ہوئے سدھر جائیں چنانچہ وہ اپنی اصل بات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان مذہب کے معاملے میں افراط وتفریط (بہت زیادہ اچھا یا بہت زیادہ بُرا) کا شکار ہیں۔ اسلام میں حق کیلئے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ جہاد کے جذبے سے سرشار ہیں وہ اللہ اکبر کے نعروں کی گونج کے ساتھ تلوار نکالے جان دینے کیلئے نکل پڑتے ہیں۔ یہ لوگ ایمان کی حرارت کے ساتھ اسلام کی بقاء کیلئے لڑتے ہیں۔ اقبالؔ کا اشارہ اُن صحابہ کرامؓ کی طرف ہے جن کے پاس ایمان کی دولت بہت تھی لیکن دنیا کی مال ودولت، ہتھیار وگولہ بارود نہیں کے برابر تھا۔ اس کے باوجود اللہ کی مدد اور نصرت کے ساتھ حق کیلئے جدوجہد کرتے ہوئے مسلمان بہت کم وقت میں آدھی دنیا پر قابض ہوگئے تھے۔ لیکن زمانہ گزرنے کے بعد مسلمانوں کی ایمانی حرارت میں کمی آگئی۔ اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں کوتاہی ہونے لگی۔ مذہبی تعلیمات کو رسم و رواج کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ خدا اور اُس کے رسول کی محبت صرف زبان پر رہ گئی اور عمل میں لوگ پیچھے رہنے لگے۔ خانقاہی نظام وجود میں آیا۔ اب لوگ مسجدوں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر تسبیح پڑھنے لگے۔ خدا اور اُس کے رسول کی تعریف کے گیت گانے میں لگ گئے۔ جبکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ صحابہؓ کی طرح عبادات اور زندگی کے ہر کام میں دین کو سامنے رکھتے اور اُس پر عمل کرتے۔ آج دنیا سے بے دینی دور کرنے کیلئے لوگوں کو دین کی دعوت پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگ خود دین پر چلیں گے اور دوسروں کو بُرائی سے روکتے ہوئے اچھے کاموں کی تلقین کریں گے تب ہی ایمان کے تقاضے مکمل ہوسکتے ہیں۔ باہر بے دینی کی آگ لگی ہے اور ہم مسجد میں یا خانقاہ میں بیٹھے ذکر میں مشغول ہوں تو یہ بے دینی کی آگ ہمارے گھروں تک آکر ہمیں اور ہماری نسلوں کو جلا کر خاک کردے گی۔ اس لئے اقبال نے اپنے خول میں بند جمادات ونباتات کی طرح ظاہری حالات پر نظر رکھنے والے، مُلّا قسم کے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کا دور صد فیصد مسلمان ہونے کا ہے۔ ہم صرف اپنے روزے، نماز، زکوٰۃ اور حج جیسی ظاہری عبادتوں سے صد فیصد مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ ہمارے ذکر واذکار ہمیں اس وقت تک کامیابی نہیں دلا سکتے جب ہم گھر اور باہر کی زندگی کے ہر کام میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہوں۔ اور صحابہؓ جیسی کامل انسانوں والی زندگی اختیار نہ کرلیں۔ یہ وہ صحابہؓ تھے جن کی تکبیر اور دعاؤں سے آسمان دہل جاتے تھے، خدائی فیصلے ہوتے تھے، سخت گرما میں دعا سے بارش ہوتی تھی۔ غیب سے غذا کا انتظام ہوتا تھا۔ سوکھے کنویں سے پانی ملتا تھا، غذا میں برکت ہوتی تھی اور زندگی میں خوشحالی آتی تھی۔ آج مسلمان حج کررہا ہے، کعبہ کی دیوار کو پکڑ کر دعا کررہا ہے لیکن چونکہ وہ صد فیصد مسلمان نہیں ایمان کی حرارت والا نہیں اس لئے اس کی دعائیں بے اثر ہیں۔ اس لئے اقبالؔ لوگوں کو صد فیصد دین پر عمل کرتے ہوئے کامل مسلمان اور کامل انسان بننے کی تلقین کرتے ہیں۔